بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نظرات

پروفیسر شاخت اور پروفیسر ہٹی

انسٹی ٹیوٹ ایک بڑی جگہ ہے بڑا اس کا نام ہے اس لئے عالم اسلام کے حکمراں۔ سفرا اور اساتذہ اور مغربی دنیا کے نامور ارباب علم جو امریکہ یا کناڈا آتے ہیں، یہاں بھی آتے ہیں اور اگر خود نہیں آتے تو بلالئے جاتے ہیں اس طرح بہت سے حضرات سے یہیں بیٹھے بیٹھے ملاقات ہوگئی اور بعض سے تو ہم مذاقی وہم مشربی کی وجہ سے ایسی بے تکلف اور مخلصانہ صحبت رہی کہ پہلی ہی ملاقات نے دوستی کا روپ دھار لیا۔ اسی سلسلہ کی دو ملاقاتوں کا حال سنئے جو ابھی حال میں ہوئی ہیں موجودہ مستشرقین کے وسیع طبقہ میں پروفیسر جوزف شاخت اور پروفیسر فلپ ہٹی آج اسلامیات کے بڑے فاضل اور محقق کی حیثیت سے مشرق اور مغرب میں مشہور و معروف ہیں اور بہت اونچے درجہ کے مصنف اور پروفیسر سمجھے جاتے ہیں۔ اور حق یہ ہے کہ ہیں بھی ایسے ہی! کسی کو اُن کے بعض افکار و نظریات سے کیسا ہی اختلاف ہو، بہرحال اُن کے وسعت مطالعہ علمی انہماک اور محققانہ بصیرت و ژرف نگاہی سے انکار نہیں ہو سکتا، پروفیسر شاخت کی کتاب "اسلامی فقہ کے مآخذ" اور پروفیسر ہٹی کی کتاب "تاریخ عرب" علمی اور تحقیقی اعتبار سے اس پایہ کی کتابیں ہیں کہ اب تک اُن کا جواب پیدا نہیں ہو سکا ہے۔ اور مقبول و مشہور اس درجہ ہیں کہ دونوں کتابوں کے متعدد اڈیشن ترمیم و اضافہ کے ساتھ شائع ہو چکے ہیں اور ہر علمی و تعلیمی ادارہ میں ان کی مانگ ہے تو ہاں! ہوا یہ کہ پہلے سے مقررہ پروگرام کے ماتحت پروفیسر شاخت ۲۹ مارچ کی صبح کو یہاں پہونچے، میں دس بجے کے قریب حسب معمول کافی کی ایک پیالی پینے کے لئے کچن میں گیا تو دیکھا کہ یہ وہاں چند اساتذہ اور طلباء کے ساتھ بیٹھے ہوئے ہیں، پروفیسر اسمتھ نے غالباً اُن سے میرا غائبانہ تعارف پہلے ہی کرا دیا تھا اس لئے ایک صاحب کی زبان سے صرف میرا نام سنکر پہچان گئے اور گفتگو شروع کر دی، موصوف جرمن نژاد ہیں اس لئے

جرمنوں کی طرح لمبے تڑنگے ہاتھ پاؤں کے مضبوط ڈیل ڈول کے فراخ وکشادہ اور ناک نقشہ کے بھاری بھرکم شخص ہیں، عمر ساٹھ پینسٹھ کے درمیان ہوگی، مگر جسم میں پھرتی اور تیزی جوان سپاہیوں کی سی ہے، یہ آج کل نیویارک کی کولمبیا یونیورسٹی میں ہیں۔ مگر عرصہ تک مصر میں بھی رہ چکے ہیں اس لئے عربی خوب روانی اور برجستگی سے بولتے ہیں، اصول پسندی اور ڈسپلن کے لئے ہر جگہ مشہور ہیں مگر طبیعت کے بیحد سادہ اور مزاج کے بڑے شگفتہ اور بے تکلف ہیں، ایک پرانا سا سوٹ نیلے رنگ کا پہنے ہوئے تھے جو معلوم نہیں کب سے استری کے لمس سے محروم تھا، پاؤں میں بوٹ بھی بغیر پالش کے تھے، پاس ہی میز پر اُن کا چمڑہ کا تھیلا رکھا ہوا تھا جو صورتِ حال سے کہہ رہا تھا کہ وہ ایک ایسے پروفیسر کی ملکیت ہے جو "خوردن برائے زیستن" پر ایمان رکھتا ہے، اُن کی اس سادگی کا میرے دل پر بڑا اثر ہوا اور فوراً عربی کا وہ مشہور مقولہ یاد آیا کہ "العلم لا یعطیك بعضه حتی لا تعطیه کلك" اپنے افکار و نظریات میں بڑے سخت اور مضبوط ہیں مگر اپنے اوپر تنقید بھی خندہ پیشانی سے سُن لیتے ہیں اور ترش رُو نہیں ہوتے۔ گفتگو کے دوران میں اُن کی مذکورۂ بالا کتاب کا ذکر آگیا تو میں نے کہا کہ جہاں تک اُس کتاب کی علمی اور تحقیقی حیثیت کا تعلق ہے اس میں کوئی شبہ نہیں کہ بڑی بلند پایہ اور معیاری کتاب ہے۔ امام شافعی کی ضخیم کتاب کتاب الام"۔ سرخسی کی مبسوط۔ امام مالک کی "المدونۃ الکبریٰ" اور امام محمد کی کتاب الآثار"، ان کتابوں کی ایک ایک سطر پر آپ کی نگاہ ہے، یہ سب ہی مگر کتاب میں ایسے مقامات کم نہیں ہیں جہاں آپ نے نتیجہ نکالنے میں جلد بازی سے کام لیا ہے" بولے" مثلاً ؟ میں نے کہا۔ "اس وقت تو آپ کی کتاب کا وہ نسخہ جو میرے مطالعہ میں رہا ہے اور جس میں میں نے کچھ نشانات بنائے ہیں، یہاں میرے پاس نہیں ہے۔ البتہ ایک بات مجھے یاد ہے آپ نے ایک مقام پر سلسلۃ الذہب پر بحث کرتے ہوئے لکھا ہے کہ حضرت نافع کا انتقال سنہ ۱۲۰ھ میں ہوا اور امام مالک کی وفات سنہ ۱۷۹ھ میں ہوئی، اس سے آپ دکھانا یہ چاہتے ہیں کہ جب دونوں کی وفات میں پچاس برس کا فاصلہ ہے تو امام مالک نے حضرت نافع سے براہِ راست کس طرح سماع کیا ہوگا۔ حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ امام مالک کی تاریخِ ولادت کے بارہ میں جو مختلف روایات ہیں اُن کے پیشِ نظر اگر ہم امام موصوف کی ولادت زیادہ سے زیادہ سنہ ۹۴ھ میں بھی مانیں تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ حضرت نافع کی وفات کے وقت وہ چھبیس برس کے تھے اور ظاہر ہے یہ عمر حضرت نافع سے سماع و اخذِ روایات کے لئے بہت کافی ہے۔ پروفیسر شاخت نے یہ بات بڑی خندہ پیشانی کے ساتھ سُنی اور اگرچہ انھوں نے اس کا کوئی جواب تو

نہیں دیا لیکن فوراً جیب سے نوٹ بک نکال کر اس میں کچھ نوٹ کر لیا، کلکتہ یونیورسٹی کے سابق پروفیسر ڈاکٹر محمد زبیر صدیقی نے پچھلے دنوں انگریزی میں "حدیث لٹریچر" کے نام سے ایک بڑی فاضلانہ اور قابلِ قدر کتاب شائع کی ہے جس میں انھوں نے خالص علمی طریقہ پر اُن اعتراضات کا جواب دیا ہے جو مستشرقین عموماً حدیث کی صحت و استناد کے متعلق کرتے ہیں، میں نے پروفیسر شاخت سے پوچھا، آپ نے یہ کتاب ملاحظہ فرمائی ہے؟ انھوں نے کہا "نہیں" اس پر فوراً ایک صاحب اُٹھے اور لائبریری سے یہ کتاب لاکر اُن کے سامنے ڈال دی، انھوں نے اس کو الٹ پلٹ کر دیکھا اور کتاب کے پبلشر کا پتہ نوٹ کرنے لگے۔ میں نے کہا "میرے پاس اس کتاب کا ایک ذاتی نسخہ موجود ہے وہ میں آپ کی نذر کرتا ہوں" چنانچہ میں نے اپنی قیام گاہ سے لاکر وہ نسخہ اُن کی نذر کیا اور ان کی فرمائش کے مطابق اس پر اپنا نام بھی لکھ دیا تو بڑے خوش ہوئے۔ اور فرمانے لگے "اب مجھے بتائیے کہ میں آپ کو اپنی کونسی کتاب بھیجوں؟ میں نے کہا" اب آئندہ آپ جو کتاب شائع کریں اس کی ایک کاپی اپنے دستخط کے ساتھ بھیجدیجئے وہ میرے لئے آپ کا ایک گرانقدر علمی تحفہ ہوگا" اس کو موصوف نے بڑی خوشی سے مان لیا، اس کے بعد موصوف کے اعزاز میں ایک لنچ تھا اس میں بھی میز پر خالص علمی گفتگو ہوتی رہی، شام کو چار بجے چائے نوشی کے بعد موصوف نے انسٹی ٹیوٹ میں سلائڈ کے ساتھ "وادی مزاب پر جو الجزائر میں خوارج کے ایک فرقہ عبادیہ کا بڑا اہم مرکز رہی ہے، ایک وقیع تاریخی لکچر دیا، اس کے بعد جب رخصت ہونے لگے تو بڑے تپاک سے مصافحہ کیا اور مجھ سے وعدہ لیا کہ میں نیویارک آؤں گا تو ان سے ضرور ملونگا۔

پروفیسر فلپ۔ کے۔ ہٹی سے ملاقات اس طرح ہوئی کہ میں اپریل کے پہلے ہفتہ میں نیویارک گیا۔ خواجہ محمد شفیع اور انسٹی ٹیوٹ کے دو طالب علم جو میرے شاگرد بھی ہیں۔ ظفر اسحاق انصاری (پی، ایچ، ڈی) اور مشیر الحق (ایم، اے) ہمراہ تھے تو وہاں سے ایک دن ہم لوگ پرنسٹن یونیورسٹی بھی گئے، جو نیویارک سے ساٹھ ستر میل کی مسافت پر ہوگی۔ نیویارک اور پرنسٹن یونیورسٹی کے متعلق اپنے تاثرات و مشاہدات تو میں سفرنامہ میں لکھوں گا، یہاں صرف پروفیسر ہٹی سے ملاقات کا ذکر کرنا مقصود ہے۔ پرنسٹن یونیورسٹی میں آج کل شعبۂ علوم مشرقیہ کے صدر پروفیسر ٹی۔ کولر۔ ینگ (T. cuyler young) ہیں یہاں سے پروفیسر اسمتھ نے موصوف کو پہلے سے میرے متعلق اطلاع کردی تھی کہ میں ۸ اپریل کو وہاں پہونچ رہا ہوں۔ مجھ کو تاریخ تو معلوم تھی مگر وقت کا کوئی تعین نہ تھا اس لئے ہم لوگ ایک بجے کے لگ بھگ یونیورسٹی پہونچے تو پروفیسر ینگ کی خاتون سکریٹری نے بتایا کہ پروفیسر موصوف

صبح سے میرا انتظار کررہے تھے اور ابھی تھوڑی دیر ہوئی، اُن کو پہلے سے ایک مصروفیت تھی اُس کے سلسلہ میں وہ چلے گئے ہیں، مگر بہرحال میرے متعلق وہ دفتر کو مکمل ہدایات دے گئے تھے، چنانچہ اُن محترمہ نے کچھ دیر ہم سے بات چیت کی اور پھر وہ ہم کو لیکر یونیورسٹی کے عظیم الشان اور نہایت وسیع ڈائننگ ہال میں آئیں، یہاں پروفیسر ہٹی نے ہم کو خیرمقدم کہا اور اب وہ خاتون تو رخصت ہوگئیں، پروفیسر موصوف ہم کو لیکر کھانے کی ایک میز پر آکر بیٹھ گئے، اس میز پر قاہرہ کی امریکن یونیورسٹی کے دو پروفیسر پطرس عبدالملک اور مصطفیٰ زیادہ اور ایک ملایا کے پروفیسر محمد محی الدین موسیٰ پہلے سے بیٹھے ہوئے تھے اُن سے تعارف ہوا۔ اور چونکہ یہ تینوں عربی بولتے تھے اور پروفیسر ہٹی بھی نسلاً عرب ہی ہیں اس لئے زیادہ تر گفتگو عربی میں ہی رہی، اس گفتگو کا موضوع عربی کا قدیم ادب، جدید ادبی رجحانات اور عرب نیشنلزم تھا، لنچ کے ختم ہونے کے بعد پروفیسر ہٹی نے مجھ سے کہا کہ آپ ابھی واپس ہو رہے ہیں، اس کا بڑا افسوس ہے، میرا جی چاہتا تھا کہ آپ کا یہاں قیام ذرا اور ہوتا تو ہم لوگ آپ سے استفادہ کرتے۔ میں نے کہا، آپ یہ کیا فرماتے ہیں میں تو آپ کا معنوی شاگرد ہوں، کیونکہ آپ کی کتاب پڑھکر میں نے ایم، اے کا امتحان دیا ہے۔ اس پر انھوں نے کچھ اُلٹی شکر گذاری کا سا اظہار کیا۔ پروفیسر ہٹی کی عمر اس وقت پچھتر چھہتر برس کی ہے۔ ۱۸۸۶ء اُن کا سال پیدائش ہے اور چہرہ اور جسم پر اُس عمر کے آثار و شواہد بھی ہیں مگر اب تک خوب کام کرتے ہیں، سیکڑوں آدمی اُن کے فیض علم سے مستفیض ہوکر علم و تحقیق کی دنیا میں نام پیدا کر چکے ہیں اور خود بھی جو کچھ انھوں نے لکھا ہے وہ کیفاً تو گرانقدر ہے ہی کمیت کے اعتبار سے بھی کچھ کم نہیں ہے۔

۱۹۵۹ء میں ان کی علمی خدمات کے اعتراف میں پرنسٹن یونیورسٹی کے شعبۂ علوم مشرقیہ نے "عالمِ اسلام" (THE WRLD OF ESLAM) کے نام سے ایک بڑی اچھی کتاب شائع کی تھی جو اسلامیات پر مختلف مقالات و مضامین کا مجموعہ ہے، اس میں ایک مضمون خود پروفیسر ہٹی کے سوانح حیات اور اُن کے کارناموں پر ہے۔ جب میں یونیورسٹی سے واپس ہونے لگا تو شعبہ کے بعض اور لٹریچر کے ساتھ پروفیسر ینگ کی طرف سے مذکورۂ بالا کتاب کا ایک نسخہ مجھ کو بھی دیا گیا۔ جس پر پروفیسر موصوف کے قلم سے انگریزی میں یہ لکھا تھا۔

"مولانا سعید احمد اکبرآبادی کی خدمت میں"

علوم مشرقیہ کے شعبہ کی نیک خواہشات کے ساتھ۔ اُن کے پرنسٹن یونیورسٹی آنے کے موقع پر میں نے

پروفیسر ہٹی سے کبھی پھر دوبارہ آنے کا وعدہ کرکے اجازت لی۔ اور پھر یونیورسٹی کے مختلف شعبے، عمارتیں۔ کتب خانہ، اور مخطوطات وغیرہ دیکھنے کے لئے روانہ ہوگیا۔ یہ داستان نامکمل رہے گی اگر اس سلسلہ میں دو عجیب واقعوں کا ذکر نہ کیا جائے، ایک تو یہ کہ جب لنچ کی میز پر بیٹھے ہوئے گفتگو ہو رہی تھی، اچانک پروفیسر ہٹی نے جیب سے ایک لفافہ نکالا اور میری طرف بڑھا دیا۔ میں نے اُسے پڑھا تو معلوم ہوا کہ وہ ہماری مسلم یونیورسٹی علی گڈھ کے ایک ریسرچ اسکالر کا خط بصورتِ درخواست ہے جس میں انھوں نے یہاں (پرنسٹن یونیورسٹی کے شعبۂ علوم مشرقیہ میں) داخلہ مع وظیفہ کی خواہش کی ہے۔ میں خط پڑھ چکا تو موصوف نے پوچھا "آپ انہیں جانتے ہیں؟ اور اگر جانتے ہیں تو کیا آپ اس کی سفارش کرنا پسند کریں گے؟" جب میں نے دونوں باتوں کا جواب اثبات میں دیا تو انھوں نے فرمایا "اچھا! تو پھر اسی پر لکھ دیجئے" میں نے فوراً اس کی تعمیل کی۔

دوسرا واقعہ یہ ہے کہ جب میں پروفیسر ہٹی سے رخصت ہوکر چلنے لگا تو ملایا کے پروفیسر محی الدین جن کا میں نے اوپر ذکر کیا ہے وہ میرے ساتھ ہوگئے۔ راستہ میں انھوں نے پوچھا "آپنے عربی اور علوم اسلامیہ کی تعلیم کہاں حاصل کی ہے؟" میں نے کہا دیوبند میں۔ وہ بولے کب" میں نے کہا" مولانا محمد انور شاہ صاحب الکشمیری کے عہد میں، جن سے مجھے شرفِ تلمذ حاصل ہے" بس یہ سننا تھا کہ موصوف مجھ سے لپٹ گئے اور کہنے لگے "پھر تو میرا آپ سے رشتہ نکل آیا۔ کیونکہ شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحبؒ کے ملایا میں ایک شاگرد تھے جن کا نام مولانا شیخ احمد خراسانی تھا۔ یہ بہت بڑے عالم اور فاضل تھے۔ ابھی حال میں اُن کا انتقال ہوا ہے، میں اُن کا شاگرد ہوں اور جلالین و مشکوٰۃ تک سب کتابیں میں نے اُن سے ہی پڑھی ہیں، اس کے علاوہ میرے دو بھائی خود دیوبند کے پڑھے ہوئے ہیں، اور ایک بھائی نے مکہ معظمہ میں مولانا عبید اللہ سندھیؒ سے درس لیا ہے۔ دیوبند کے اس تعلق کی وجہ سے موصوف سے بڑا مخلصانہ تعلق پیدا ہوگیا۔" چنانچہ پرنسٹن سے میں اور وہ ساتھ ہی نیویارک واپس لوٹے اور پھر وہ نیویارک سے مونٹریل بھی آئے اور تین دن یہاں رہ کر لندن روانہ ہوئے۔